مسلمانوں کا قومی اسلام، صدیوں اسلام کی آفاقیت سے مزاحم ہوتا رہا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو شاید خلافِ واقعہ نہ ہو کہ دین کی اس خالص تہذیبی تعبیر نے صدیوں سے اسلام کی آفاقیت کو شکست دے رکھا ہے۔ فی زمانہ ان فتووں پر کسے اب یقین آئے گا کہ غیر عربی طرز کے لباس پہننا یا غیر عربی انداز سے بالوں کا تراشوانا حرام ہے یا یہ کہ فارسی زبان کا سیکھنا (جس میں اب انگریزی، فرنچ، جرمن اور دوسری غیر عرب زبانوں کو بھی شامل کیا جانا چاہیے) من تشبہ کی رو سے حرام ہے۔ اب کون اس بات پر یقین کرے گا کہ انگریزی زبان منافق بناتی ہے؟ اور کون اس فتوے کو معتبر سمجھے گا کہ غیر مسلم ملکوں میں رہائش اختیار کرنے والا شخص بروز حشر مشرکوں میں اٹھایا جائے گا؟ کیا اہل سنت والجماعت کا کوئی شخص آج بھی ابن تیمیہ کی طرح اس عقیدے کا متحمل ہوسکتا ہے کہ جنس عرب جنس عجم سے افضل ہے؟

مستقبل اسلامی کی تلاش

جب لوگ باہم ملا دیئے جائیں گے
جب نوزائیدہ زندہ درگور بچی سے پوچھا جائے گا کہ وہ کس جرم کی پاداش میں قتل کی گئی
جب صحیفوں کی نشر واشاعت کی کثرت ہوگی
جب جنت قریب لے آئی جائے گی
تب ہر شخص کو پتہ چل جائے گا کہ وہ اپنے لئے کیا لایا ہے۔
(تکویر:۱۴۷)

سورۃ تکویر کی ان آیات کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہن برملا سائبر اسپیس کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔اور کیوں نہ ہو قرآن مجید جس ذات باری کا کلام ہے وہ زمان ومکان کے فرق سے ماوراء چیزوں کو اس کی اصل ماہیت کے ساتھ اس طرح دکھاتا ہے گویا ازل تا ابد بجلی کی ایک چمک اور بصیرت کی ایک رعد کے ساتھ سب کچھ اچانک ایک لمحے کے لئے منور ہوگیا ہو۔

عام انسانی دنیا سے ماوراء ایک ایسے virtual world کا وجود میں آجانا جہاں کروڑہا کروڑ نفوس ایک دوسرے سے بحث ومباحثہ اور باہمی استفادے میں مشغول ہوں، ایک حیرت ناک وقوعے سے کم نہیں۔ عالمِ محسوسات سے پرے ایک ایسی اضافی دنیا کا وجود جو مسلسل ہماری زمینی زندگی کو متاثر کر رہی ہو، اب ایک ایسی حقیقت ہے جسے مزید نظر انداز کرنا اب ماضی پرست قوموں کے لئے بھی ممکن نہیں رہا۔صحیفوں کی نشر واشاعت کا یہ عالم ہے کہ جس موضوع پر بھی بٹن دبایئے معلومات کا ایک لامتناہی سمندر موجود ہے۔ ہر قسم کے افکار وخیالات اپنی تمام تر خباثتوں اور سعادتوں کے ساتھ قاری کے منتظر ہیں۔انٹرنیٹ کی اس virtual دنیا میں نہ کوئی محتسب مؤثر رہ گیا ہے اور نہ ہی کسی خیال کو محض قوت کی بنیاد پر دبا ڈالنا ممکن ہے۔مزے کی بات یہ ہے کہ اس سائبر دنیا کا نہ کوئی مرکز ہے اور نہ ہی کسی خاص تہذیب یا عسکری قوت کی اس دنیا پر اجارہ داری ممکن رہ گئی ہے۔ گویا Cyber Space ایک ایسی پوسٹ ماڈرن دنیا کی ایک جھلک ہے جہاں خیالات کو محض اس کی حقیقی قدر وقیمت کی بنیاد پر قبول یا

رد کیا جانا ممکن ہو سکے گا۔ اب انسانی دل و دماغ کیلئے یہ ممکن ہے کہ وہ مولوی یا محتسب کی چیرہ دستیوں سے یکسر آزاد ہو کر تہذیبی اور قومی سطح سے اوپر اٹھ کر اللہ کے عطا کردہ قلبِ سلیم کو حتی المقدور استعمال میں لائے اور پھر اپنی صوابدید پر، عقل و نظر کی روشنی میں اپنے لئے ایک بہتر راستے کا انتخاب کر سکے۔ انٹرنیٹ کی دنیا میں شیطان کے وساوس بھی ہیں اور خدا ترسوں کی دردمند رہنمائی بھی۔ فقہاء و مشائخ کے طئے کردہ حتمی جواب بھی ہیں اور وحی ربانی کو سمجھنے کیلئے خود اپنے دل و دماغ کو متحرک کرنے کی دعوت بھی۔ اگر ایک طرف مختلف نظریات کا اپنا اپنا مسحور کن پروپیگنڈہ ہے تو دوسری طرف اس کے رد میں بھی کم مضبوط دلائل نہیں۔ گویا ﴿اذا الصحف نشرت﴾ کا غلغلہ ہر طرف بلند ہے۔ واشنگٹن کے پر آسائش سوٹ میں بیٹھنے والا انسان ہو یا افغانستان کے نامعلوم پہاڑی سلسلوں میں بسنے والا شخص، انٹرنیٹ کی دنیا میں دونوں برابر کا شریک ہے۔

دیکھا جائے تو انسانی تاریخ میں فکر و نظر کی آزادی کا اتنا وافر امکان پہلے کبھی نہ تھا۔ قلب و نظر کو جلا بخشنے کیلئے جس ذہنی افق اور بین الاقوامی مباحثے کی ضرورت تھی، اس کا ماحول تیار ہو چکا ہے۔ اس نئی صورتحال نے روایتی علماء کے قیل و قال سے پَرے ،فرقہ وارانہ تعبیر اور مسلکی تشریحات سے ماوراء، ایک ایسے ہمہ گیر مباحثے کی بناء ڈال دی ہے جس کے بطن سے فی زمانہ دینِ خالص کے طلوع ہونے کے امکانات وا ہو گئے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ انٹرنیٹ کی دنیا میں فکر و نظر کی بے مہار آزادی ہمیں ایسے سطحی اور junk مباحثے میں بھی الجھا سکتی ہے جس سے ہماری موجودہ پریشاں خیالی میں مزید اضافہ ہو جائے۔ Information کے اس سیلاب میں disinformation کے ریلے بھی بہہ رہے ہیں۔ ان خطرات کا مقابلہ تو بہر حال کرنا ہوگا۔ دودھ کو پانی سے اور حق کو باطل سے ممیّز کئے بغیر ہماری منزل بامراد نہ ہوگی۔ البتہ جو لوگ وحی کی روشنی کو اپنی مشعلِ راہ بنانے کا عزم رکھتے ہوں ان کے لئے عمومی کنفیوژن کی اس فضا میں راستہ بنانا کچھ مشکل نہ ہوگا۔

کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم سائبر ورلڈ میں کسی نئے اسلام کے ظہور کے منتظر یا اس کے لئے کوشاں ہیں۔ دین خالص وحی ربانی کو ایک ایسی صورت حال میں پیش کرنے سے عبارت ہے جب زمان و مکان یا تہذیبی مظاہر کا پرتو وحی ربانی پر تقریباً معدوم ہو گیا ہو۔ خدا کا دین بندوں کی اس سائبر دنیا میں کچھ اس طرح جلوہ فگن ہو گویا وہ تمام انسانوں کو شمولیت کی یکساں دعوت دے رہا ہو۔ نہ وہ مشرق کا پرستار ہو نہ مغرب کا مخالف، نہ اسے عربوں سے کوئی خاص انسیت ہو نہ عجمیوں سے کسی درجے کی مخاصمت، نہ وہ ایشیاء والوں کا دین سمجھا جاتا ہو اور نہ کسی ایسے خاص تہذیبی قالب کا حامل کہ اہل مغرب اسے Middle-Eastern Religion قرار دیتے ہوں، گویا ایک ایسا اسلام جس کی مکمل تصویر قرآن مجید کے دفتین میں پائی جاتی ہو اور جسے سمجھنے کیلئے مسلمانوں کی تہذیبی تاریخ یا اموی، عباسی جاہ و حشم کے بیان کی چنداں ضرورت نہ ہو اور نہ ہی مسلم اسپین، مغل دہلی اور عثمانی ترکوں کی تہذیبی تاریخ کا اس پر پرتو پایا جاتا ہو۔ ایک ایسا اسلام جو تمام انسانیت کا نجات دہندہ ہو اور جس کے غلبے کی دعوت کسی خاص

قوم کے تہذیبی غلبہ کی نفی سے عبارت ہو۔محمد رسول اللہ جو کہ کافۃ للناس بشیراونذیرا ہیں اور جن کی رحمۃ للعالمینی پر قرآن کے صفحات گواہ ہیں،ان کی دعوتِ لاالٰہ کی منطقی انتہا ایک ایسے ہی منظرنامے کی طالب ہے جب تمام مسلکی مظاہر سے اوپر اٹھ کر عالمی سطح پر انسانوں کو خدائے واحد کی بندگی میں مربوط کردیا جائے۔ایک ایسے غیر تہذیبی اسلام کے ظہور کیلئے سائبر دنیا سے بہتر اور کون سی جگہ ہوسکتی ہے؟

روایتی مسلم ذہن کیلئے سائبر ورلڈ نئے چیلنجز کی آماجگاہ ہے۔قدیم فقہی اصطلاحوں کا یہاں سرے سے اطلاق ہی نہیں ہوتا۔ سائبر ورلڈ میں دارالاسلام او ردارالکفر کی اصطلاحیں بے معنی ہو کر رہ گئی ہیں، یہاں نہ کوئی centre ہے اور نہ periphery- بیک نظر مجموعی طور پر اس دنیا میں خیر بھی ہے اور شر بھی۔امکانات کے اس سمندر سے فرد پر منحصر ہے کہ وہ اپنے کوزے میں کیا کچھ توشہ جمع کرتا ہے۔کل تک جو لوگ دنیا کو تہذیبی اکائیوں میں منقسم دیکھنے کے عادی تھے، یا جو محمد رسول اللہ کے آفاقی پیغام کو عرب تہذیب میں محدود کئے دینے کے قائل تھے، یا جو یہ سمجھنے کی غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ عرب تہذیبی مظاہر ہی دینِ اسلام کی واحد مستند شکل ہیں، ان کے لئے یقیناً اس نئی صورتحال کو سمجھنا مشکل ہوگا کہ کس طرح سائبر ورلڈ میں اسلام کا آفاقی پیغام، اپنے قدیم عربی قالب سے ماوراء، تمام انسانوں کیلئے یکساں توجہ اور کشش کا باعث بن رہا ہے۔ ہمارے زوال کے عہد میں تحفظِ اسلامی کی خاطر عرب تہذیبی مظاہر پر غیر ضروری اصرار کی جو لئے اپنے اپنے زمانے میں ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے یہاں غیر معمولی طور پر بلند ہوتی گئی تھی اور جس کے نتیجے میں اسلام کو عرب مشرقی ورثے کے طور پر دیکھنے کا رواج عام ہوا، التباسات کی یہ دھند بھی اب چھٹنے کو ہے۔ ﴿اذ النفوس زوجت﴾ کی عمومی فضا میں اب ہمارے لئے یہ سمجھنا آسان ہے کہ آفاقی نبی کی امت کسی ایک تہذیبی مظاہر، جغرافیائی ماحول اور اس سے متاثر لباس کی متحمل نہیں ہوسکتی۔اب بھی اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ کسی خاص زبان سے اسلام کو نفرت ہے یا کوئی خاص لباس غیر قوموں کا لباس ہے جس کے پہننے سے اسلام رخصت ہو جاتا ہے تو اس کا یہ سمجھنا ایک بین الاقوامی پیغمبر کی آفاقیت کو مشتبہ کردیتا ہے۔ من تشبہ بقوم فھو منھم کی فرضی حدیث اور اس کی خیالی تعبیرات نے صدیوں سے اسلام کو ایک عرب تہذیبی اکائی کے طور پر متعارف کرا رکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مکانی فاصلوں کے سکڑنے کی وجہ سے اب یہ مفروضات خود بخود ختم ہورہے ہیں۔کل تک جو بات فقہائے حنابلہ، فقہائے احناف کیلئے سمجھنا مشکل تھی اور جس کی وجہ سے تہذیبی مظاہر کی بنیاد پر کفر واسلام کے فتوے صادر کرنے کا رواج عام تھا آج وہی بات نئی سکڑتی دنیا میں قرآن کے معمولی طالب علم کے لئے بھی سمجھنا آسان ہوگئی ہے کہ تہذیبی مظاہر یا لباس کی بنیاد پر کفر واسلام کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ابن تیمیہ کا یہ فہم جس کا شدید اظہار انہوں نے اقتضاء صراط المستقیم فی مخالفہ اصحاب الجحیم میں کیا ہے اور اس قبیل کے دیگر علماء کا قومی اسلام، صدیوں اسلام کی آفاقیت سے مزاحم ہوتا رہا ہے۔ بلکہ یہ کہا جائے تو کچھ خلافِ واقعہ نہ ہوگا کہ دین کی اس

خالص تہذیبی تعبیر نے صدیوں سے اسلام کی آفاقیت کو شکست دے رکھا ہے۔ ﴿اذا النفوس زوجت﴾ کے موجودہ ماحول میں اب ان فتووں پر کسے یقین آئے گا کہ غیر عربی طرز کے لباس پہننا یا غیر عربی انداز سے بالوں کا تراشوانا حرام ہے یا یہ کہ فارسی زبان کا سیکھنا (جس میں اب انگریزی، فرنچ، جرمن اور دوسری غیر عرب زبانوں کو بھی شامل کیا جانا چاہیے) من تشبہ کی رو سے حرام ہے۔ اب کون اس بات پر یقین کرے گا کہ انگریزی زبان منافق بناتی ہے؟ اور کون اس فتوے کو معتبر سمجھے گا کہ غیر مسلم ملکوں میں رہائش اختیار کرنے والا شخص بروز حشر مشرکوں میں اٹھایا جائے گا؟ کیا اہل سنت والجماعت کا کوئی شخص آج بھی ابن تیمیہ کی طرح اس عقیدے کا متحمل ہوسکتا ہے کہ جنس عرب جنس عجم سے افضل ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی خالص قومی اور تہذیبی تعبیر نے ایک آفاقی دین کو نہ صرف یہ کہ ایک عرب مشرقی ورثے کی حیثیت دے دی بلکہ آنے والے دنوں میں حاملین قرآن کیلئے خالص قومی بنیادوں پر مسابقت کی طرح بھی ڈال دی۔ دوسری قوموں کی طرح مسلمان بھی عالمی غلبہ کا خواب دیکھنے لگے۔ پندرہویں صدی ہجری کی ابتداء میں اسلامی نشاۃ ثانیہ کے حوالے سے غلبۂ اسلام کی جو امید بندھی تھی اس سے غیر تو یہ سمجھتے ہی تھے کہ مسلم قوم ایک بار پھر دنیا پر اپنے سیاسی غلبہ کا خواب دیکھ رہی ہے، خود مسلم ذہنوں میں بھی اسلامی صدی کا مفہوم اس سے کچھ مختلف نہ تھا کہ صدیوں سے جو قوم مسلسل پسپائی اختیار کرتے ہوئے تاریخ کے حاشیے پر چلی گئی ہے وہ ایک بار پھر دنیا پر غالب ہونے کو ہے۔ قومی اسلام کے اس تصور نے دوسری قوموں کی طرح اہل اسلام کو بھی مسابقت کی اس دوڑ میں مبتلا کر دیا۔ اہل یہود جن کا دعویٰ ہے کہ بیسویں صدی میں وہ اپنی موثر ترین سرگرمیوں کی وجہ سے اکیسویں صدی کی قیادت کے سب سے زیادہ سزاوار ہیں یا مغرب کی بعض اقوام خصوصاً امریکہ جو اکیسویں صدی پر مکمل غلبہ کو اپنا حق سمجھتا ہے، اسی طرح مسلم ذہنوں میں بھی قومی اسلام کے زیر اثر یہ خیال پرورش پاتا رہا ہے کہ پندرہویں صدی ہجری یا اکیسویں صدی عیسوی آخر مسلمانوں کے غلبہ واستیلاء کی صدی کیوں نہ ہو؟۔ افغانستان میں سوویت یونین کی شکست کے بعد مجاہدین کی جواں سال قیادت کے ذہنوں میں فطری طور پر اس خیال نے انگڑائی لی کہ سوویت یونین کے زوال کے بعد اب ان کا منطقی وظیفہ یہ رہ گیا ہے کہ وہ امریکہ کے خلاف اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر دیں۔ ان کے نزدیک مغرب پر مشرق کی فتح کا یہی ایک واضح اور آسان راستہ تھا۔ اس میں شبہ نہیں بن لادن اور دوسرے عرب مجاہدین کو اس تہذیبی ٹکراؤ کی راہ پر ڈالنے والے دوسرے عناصر بھی تھے البتہ مغرب کے مقابلے میں ایک مشرقی اور قومی اسلام کی فتح کا داعیہ ان کے دل ودماغ کو مسلسل مہمیز کرتا رہا ہے۔

تہذیبی اسلام کا یہ مروجہ قالب جو عرب مشرقی ثقافت کو اسلام کا لازمی جز قرار دیئے بیٹھا ہے، نفسیاتی طور پر اس بات کا متحمل نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسری تہذیب کی سعید اور صالح روحوں کو بھی غلبۂ اسلام کے منصوبے میں شامل کر سکے یا یہ کہ اسلام کو ایک ایسے ہمہ گیر بین الاقوامی قالب میں متحضر دیکھے جہاں تہذیبوں کے بجائے صرف وحی ربّانی کی بنیاد پر ایک نئی دنیا کی تعمیر کا منصوبہ پایا جاتا

ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس مروجہ تہذیبی اسلام نے مسلم نوجوانوں کے ذہنوں سے اسلام کی آفاقیت اور تمام ہی اقوام وملل کیلئے نصح و خیرخواہی، ہمدردی وغم گساری جیسے جذبات کو دور کر رکھا ہے جو داعی کا بنیادی وصف ہے۔ اسلام کو اس محدود تہذیبی خول سے نجات دلانے اور اسے پیغمبرانہ آفاقی پیغام کی حیثیت سے پیش کرنے کیلئے ہمیں اپنے تہذیبی اور علمی ورثے کے سخت احتساب کی ضرورت ہوگی۔ اندیشہ ہے کہ اس عمل میں بڑے بڑے شارحین اور علمائے عظام کا اعتبار ساقط ہو جائے۔ جو لوگ بعض اصحاب سلف کو یا اپنی پسند کے ائمہ وفقہاء کو قرآنِ مجید کی شاہِ کلید قرار دیتے آئے ہیں اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ ان حضرات کے بغیر فہم قرآن کا قفل نہیں کھُل سکتا، ان کے لئے اس صورتِ حال کا ادراک یقیناً مشکل ہوگا۔ صدیوں سے جو لوگ اسلامی فلسفہ، اسلامی آرٹ، اسلامی فنونِ لطیفہ اور اسلامی طرزِ تعمیر جیسی اصطلاحوں میں کلام کرتے رہے ہیں، ان کو یہ باور کرانا کچھ آسان نہ ہوگا کہ عباسی بغداد کا فنونِ لطیفہ، مسلم اسپین کا سائنسی عروج، اور مغل سلطنت کے تاج محل یا لال قلعہ کے لافانی نقوش، جن کو مسلمان اپنی تہذیبی تاریخ کے سنگ میل کے طور پر پیش کرتے ہیں دراصل ہم ان تمام کاموں کیلئے مامور ہی نہیں کئے گئے تھے۔ قومی افتخار کی ان تمام علامتوں کا کارِ نبوت سے کچھ بھی علاقہ نہیں۔ رہا علم وحکمت اور علوم وفنون کی ترقی تو یہ کسی قوم کی میراث کبھی نہیں سمجھے گئے۔ یہ نوع انسانی کا مشترکہ ورثہ ہیں اور انہیں اسی حیثیت سے دیکھا جانا چاہیے۔

قومی اسلام کا یہ تصور جس کی جڑیں ہمارے متقدمین کی فہم وبصیرت میں ہیں، خالص اسلام کی طرف ہماری مراجعت میں مسلسل مزاحم ہوتی رہی ہیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ اسلام کے اس قومی تصور نے فی زمانہ پوری دنیا میں مسلم نوجوانوں اور ان کی احیائی تحریکوں کو ایک غولِ بیابانی میں تبدیل کر رکھا ہے۔ قدیم مشرقی ثقافتی علامتوں کو وہ اسلام سمجھ بیٹھے ہیں، جس سے ذرہ برابر بھی انحراف کفر واسلام کی جنگ بن جاتی ہے۔ مسلمانوں کے جغرافیائی تنازعے اور وطنی آزادی کی تحریکیں جہادِ فی سبیل اللہ قرار پاتی ہیں۔ ثقافت اور اسلام کے اس مسلسل دھوپ چھاؤں کے کھیل نے خود مسلم ذہنوں پر اسلام کی ماہیت اور اس کے مستقبل کے سلسلے میں سخت ابہام اور مغالطوں کو جنم دیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مسلمان گذشتہ چند صدیوں سے من حیث القوم مسلسل پسپائی کے شکار ہیں اور گذشتہ چند برسوں سے پسپائی کا یہ عذاب اپنی انتہاء پر ہے۔ افغانستان، عراق، فلسطین، بوسینا، کشمیر، گجرات، فلپین اور چیچنیا جہاں بھی خون بہہ رہا ہے وہ ان ہی قومی مسلمانوں کا خون ہے۔ امریکہ، برطانیہ اور مغرب کے دوسرے شہروں میں دہشت گردی کے نام پر مسلم نوجوان ہی نشانے پر ہیں۔ گوانٹنا موبے کی عقوبت گاہ یا ابوغریب کی جیل میں جو کچھ ہوا اسکا شکار بھی مسلم قوم ہی بنی۔ لیکن ان سب کے باوجود اگر مسلمان بھی مدافعت کی جنگ میں ان اعلیٰ انسانی اقدار کو نظر انداز کر گئے تو پھر دوسری قوموں پر ان کا وجۂ امتیاز کیا رہ جائے گا؟ گجرات میں ہم جلائے گئے، بوسنیا میں ہماری عزتیں تاراج ہوئیں۔ فلسطین میں ہم ایک منظّم ریاستی دہشت گردی کا شکار ہیں لیکن اس کے جواب میں ہم اپنے دشمنوں کے ساتھ عین یہی سب کچھ نہیں

کر سکتے۔قومی مسلمانوں کیلئے تو یہ ممکن ہے کہ وہ اپنی قوم کے مقابلے میں دشمن قوم کوزک پہنچانے کیلئے کوئی بھی اقدام کر ڈالیں۔ البتہ وحی کا آفاقی نقطۂ نظر ہمیں مسلسل اس بات کی تلقین کرتا ہے کہ ہم بعض شیطان صفتوں کی وجہ سے اس پوری قوم کو من حیث القوم قابلِ گردنِ زدنی قرار نہیں دے سکتے۔ہم جو انسانوں کی نصح وخیر خواہی اوران کی فلاح ونجات کے لئے پیدا کئے گئے ہیں ہم انھیں اس طرح دیکھتے ہیں جیسا کہ وہ ہیں نہ یہ کہ ان کا تعلق کس قوم سے ہے۔ بڑے بڑوں کے دل ودماغ پر مسلم قومی افتخار اور مسلم قومی مفاد کے جذبات اتنے شدید ہیں کہ وہ کسی بھی مسئلہ پر خالص حاملِ قرآن کی حیثیت سے سوچنے کا یارا نہیں رکھتے۔ مسئلہ فلسطین کا لاینحل ہونا خدائے واحد کی علمبردار دوقوموں کا اتنے طویل عرصے تک آپس میں اس طرح گتھم گتھا ہونا اور پھر اس صورتِ حال پر مسلمانوں اوراہل یہود کے علماء ومتقین کا مسلسل خاموش رہنا اسی بات کا تو ثبوت ہے کہ اہل یہود کے علماء کی طرح مسلم اہل فکر بھی قومی افتخار کے اس حد تک اسیر ہو گئے ہیں کہ وہ کوئی غیر روایتی حل پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔دنیا فساد سے بھرتی جارہی ہے۔قوموں کے تصادم کے اس ماحول میں جہاں خود حاملین قرآن بھی بدقسمتی سے اس قومی تصادم میں فریق بن گئے ہیں،ضرورت اس بات کی ہے کہ اس آفاقی اسلام کو وحی کے دفتین سے ازسرِ نو برآمد کیا جائے جس کے پسِ پشت چلے جانے کی وجہ سے ہم تاریخ کے انحراف میں جینے پر مجبور ہیں۔